پریشان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسے کبھی حقیقی روحانی تسکین حاصل نہیں ہوتی۔ اور وہ اپنی ذات، خدا کی ذات اور اشیاء کی ماہیت سے بے خبر رہتا ہے۔ اور جونہی وہ جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے، اپنی انفرادیت کو کھو دیتا ہے۔ اس کے برعکس ایک عالم انسان، عالم ہونے کی حیثیت سے کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذات، خدا کی ذات اور اشیاء کی ماہیت سے ایک ابدی احتیاج کے ماتحت باخبر ہوتا ہے۔ وہ کبھی اپنی انفرادیت کو نہیں کھوتا اور اسے ہمیشہ اطمینانِ قلب میسر رہتا ہے۔ اس منزل پر پہنچنے کا جو راستہ میں نے بتایا ہے۔ اگرچہ وہ مشکلات سے پُر ہے پھر بھی اسے اپنا لینا ممکن ہے اور چونکہ شاذونادر ہی اس کا پتہ ملتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ بہت کٹھن ہے ورنہ کس طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ قریباً سب کے سب لوگ اس سے لاپرواہ اور بے خبر رہتے؟ لیکن تمام افضل چیزیں جتنی زیادہ کمیاب ہوتی ہیں ان کو حاصل کرنا اتنا مشکل ہوتا ہے۔

رسالہ سیاسیات | اب ہمیں اس کی آخری کتاب "رسالۂ سیاسیات" (Political Treatise) کا مطالعہ کرنا ہے جو اس کے پختہ ترین خیالات کا نتیجہ ہے۔ لیکن جو اس کی قبل از وقت موت کی وجہ سے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ اگرچہ یہ نہایت مختصر سی کتاب ہے۔ لیکن خیالات کی پختگی کے لحاظ سے اعلیٰ ترین کتب میں سے ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد ہمیں یہی خیال آتا ہے کہ اس کریم النفس فلاسفر کی بے وقت موت سے علمی دنیا کو کتنا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا۔

سپینوزا کا خیال ہے کہ تمام سیاسی فلسفہ کی بنیاد فطری اور اخلاقی، نظام۔ یعنی منظم سوسائٹی کے ظہور پذیر ہونے سے قبل اور بعد کے زمانوں کی تفریق پر رکھی جانی چاہیئے۔ پہلے پہل جب انسان (انفرادی) زندگی بسر کرتے تھے اور کسی معاشرتی تنظیم اور کسی قانون کے پابند نہ تھے تو وہ صحیح معنوں میں خود مختار تھے۔ وہ اچھائی، برائی، انصاف اور ظلم کے الفاظ سے آشنا نہ تھے، زورِ بازو ہی ان کا اخلاقی معیار تھا۔ وہ فطرت کی گود میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ حفظِ نفس کے علاوہ انھیں کوئی فکر نہ تھی۔ ان کے کان گناہ کے نام سے ناآشنا تھے۔ وہ اپنی ضروریات کے بندے تھے جنھیں پورا کرنے کی خاطر وہ سب کچھ کرنے کو تیار رہتے تھے۔

لیکن آہستہ آہستہ مشترکہ ضروریات کے ماتحت وہ باہمی میل ملاپ اور ایک دوسرے کی امداد پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ انسان تنہائی سے گھبراتا ہے۔ دوسرے ایک تنہا آدمی نہ تو آسانی سے اپنی حفاظت کر سکتا ہے اور نہ ہی ضروریاتِ زندگی کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ انہی مجبوریوں کی وجہ سے اجتماعی زندگی کا آغاز ہوتا ہے جو ترقی کے مختلف مدارج سے گزر کر معاشرت کی موجودہ منازل تک پہنچتی ہے۔ اجتماعی زندگی جوں جوں آگے بڑھتی ہے وہ قدرتی نظام جس کی بنیاد طاقت پر ہوتی ہے۔ اس اخلاقی نظام میں جو باہمی ذمہ داریوں اور حقوق پر مبنی ہوتا ہے تبدیل ہو جاتی ہے۔ انسان اپنی فطری طاقت کا کچھ حصہ اپنی قوم کے حوالہ کر دیتا ہے۔ تاکہ اپنی باقی ماندہ قوت زیادہ آزادی سے استعمال کر سکے۔ مثلاً وہ غصہ کے شدید جذبہ کے ماتحت بھی تشدد پر اترنے سے باز رہتا ہے تاکہ دوسروں کے ایسے ہی تشدد سے محفوظ رہے۔ چونکہ انسان جذبات کا بندہ ہے اس لئے قوانین ضروری ہو جاتے ہیں۔ اگر تمام انسان معقول ہوتے تو قانون کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ ایک بہترین ریاست اپنے شہریوں کے اختیارات کو اسی حد تک محدود کرتی ہے جس حد تک ان کے باہمی طور پر تباہ کن ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی ایک اختیار کو چھینتی ہے تو اس کی جگہ اس سے وسیع تر سونپ دیتی ہے۔

حکومت کا آخری مقصد نہ تو انسانوں پر غلبہ حاصل کرنا ہے اور نہ ہی ان کو خوف سے قابو میں رکھنا۔ بلکہ ہر فرد کو خوف و خطر سے یہانتک چھٹکارا دلانا ہے کہ وہ رہنے سہنے اور کام کاج میں اپنے آپ کو بالکل محفوظ سمجھے اور ہر قسم کے نقصان سے بچا رہے۔" حکومت کا مقصد آزادی ہے۔ کیونکہ اس کا فرض نشوونما کو ترقی دینا ہے اور نشوونما کے لئے آزاد فضا کا ہونا لازمی ہے۔"

سپینوزا اگرچہ ریاست کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن وہ اس پر اعتماد نہیں رکھتا۔ کیونکہ قوت ایماندار سے ایماندار اشخاص کو بھی بداطوار بنا دیتی ہے۔ اس لئے ریاست کو انسانی ذہن پر جتنا بھی کم اختیار دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ ریاست کا اقتدار انسانی اعمال و اجسام تک ہی محدود ہونا چاہئے۔ انسانوں کے خیالات اور ان کی روحیں بالکل آزاد رہنی چاہئیں۔ کیونکہ

تین حصے ہیں۔ (۱) تلنگانہ (۲) مرہٹواڑی (۳) کرناٹک۔ تلنگانہ[۱] کی زبان تلنگی (تلگو) مرہٹواڑی کی مرہٹی اور کرناٹک کی کنڑی ہے۔ مرہٹی کا تعلق آریائی السنہ سے ہے اور باقی دو کا دراوڑی زبانوں سے۔ اس لئے یہ دونوں زبانیں آریائی سلسلہ کی زبانوں سے زیادہ قدیم سمجھی جاتی ہیں۔ کیونکہ دراوڑی آریاؤں سے بہت پہلے ہندوستان کے مہذب باشندے تھے۔ مگر آریاؤں کے ہندوستان کو آریاورت بنا چکنے کے بعد ان ہر دو سلسلے کی زبانوں کا ایک دوسرے پر اثر پڑنا ناگزیر تھا چنانچہ اب تک ان ہر دو کے بعض الفاظ ایک دوسرے میں پائے جاتے ہیں۔

پُر | سنسکرت میں پُر[۲] کے معنی بڑی بستی کے ہیں۔ یہ لفظ بعد میں چلکر اس سے نکلی ہوئی زبانوں میں پور اور پوری ہوگیا جیسے رام پور اور جگناتھ پوری وغیرہ۔ ایک قیاس تو یہ ہے کہ یہی لفظ پُر دراوڑی زبانوں میں آکر اُر ہوگیا۔ اور پھر پور کے وزن پر اُور بن گیا۔ اور اس قیاس کی بھی گنجایش ہے کہ دراوڑی زبان کا اُر آریائی زبانوں میں پُر ہوگیا۔

بہرحال اس وقت یہ لفظ ریاست کی تینوں زبانوں میں مستعمل ہے مگر سمجھا جاتا ہے کہ یہ لفظ ہے خاص کنڑی زبان کا جو دراوڑی نسل سے ہے۔ اس زبان میں اس کے معنی بستی اور گاؤں کے ہیں اور کسی ایک لفظ سے مل کر بطور لاحقہ کے کلمہ کے آخر میں آتا ہے جیسے کلور۔ کل[۳] کے معنی کنڑی میں پتھر کے ہیں۔ چونکہ دکن زیادہ تر پہاڑی ملک ہے اس لئے اگر کسی پتھریلے حصے میں گاؤں آباد ہوا تو اسی مناسبت سے اس کا نام کلور[۴] یعنی پتھریلا گاؤں رکھدیا اب اسی لاحقہ کے ساتھ اور نام بھی سنئے۔ جاور[۵]۔ لاتور، چنور، راجور، کسنور، ان میں کثرت استعمال سے یا سہولت تلفظ کے لئے الف ساقط ہوگیا ہے۔

۱؎ اس کا قدیم نام آندھرا دیس ہے۔ ۲؎ پُر کے معنی بسنے والے کے ہیں۔

۳؎ یہ لفظ خاص کنڑی زبان کا ہے۔ ۴؎ دکن میں اس نام کے کئی گاؤں ہیں۔

۵؎ یہ اصل میں جے اُور ہے۔ جے کے معنی فتح کے ہیں۔ جے اُور کے معنی فتح نگر یا فتحپور کے ہوئے۔

یزدانی صاحب کی تحقیق

مولوی غلام یزدانی صاحب سابق ناظم محکمۂ آثارِ قدیمہ ریاست حیدرآباد دکن نے اپنے ایک مضمون "دکن کی زمانۂ قبل تاریخ کی یادگاریں" میں لکھا ہے:۔

"حیدرآباد کی نواح میں تاریخی زمانہ سے پہلے کے آثار اور قبور موجود ہیں۔ ان آثار کا سلسلہ کوہِ مولیٰ کے دامن سے لیکر بوین پلی، حشمت پیٹھ اور بیگم پیٹھ سے گزرتا ہوا النگم پلی تک چلا گیا ہے۔ یہ قبور اس خاص خطے ہی میں محدود نہیں بلکہ اضلاع کریم نگر، ورنگل، نلگنڈہ، محبوب نگر رائچور اور گلبرگہ میں مختلف مقامات پر مختلف خصوصیات کے ساتھ موجود ہیں۔ جنوبی ہند میں یہ سلسلہ ریاست میسور سے گزرتا ہوا تناولی تک پہنچا ہے۔ اور شمال دکن میں صوبجاتِ متوسط سے چل کر سندھ اور بلوچستان تک پہنچا ہے۔ چھوٹے ناگپور میں بھی اس قسم کے آثار پائے گئے ہیں۔ [1]

قبور کا سلسلہ ہندوستان سے باہر ایک جانب ایران سے گزرتا ہوا ایشیائے کوچک تک پہنچتا ہے اور وہاں ختم ہونے کے بجائے بحرِ روم کے تمام جزائر اور متصل ممالک میں پھیلا ہوا ہے اور پھر غربی یورپ میں اسپین، فرانس اور انگلینڈ تک چلا گیا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے جانبِ شمال ممالک میں وسطِ ایشیا سے لیکر جس میں جاپان بھی شامل ہے سائبیریا تک پہنچتا ہے۔ ان دور دراز ممالک کی قبور میں، بیرونی ہیئت اور سامان وعقائد کے لحاظ سے جو تحقیق سے معلوم ہوئے ہیں بیحد مماثلت پائی جاتی ہے۔ مثلاً جنوبی ہند میں بعض مٹی کے تابوت اس قسم کے دریافت ہوئے ہیں کہ ان کی شکل مغربی وضع کی شیرینی کی قاب (Pudding dish) سے ملتی ہے۔

آپ کو تعجب ہوگا کہ بعینہٖ اسی قسم کے تابوت قدیم قبور سے جو کلدانیوں سے منسوب ہیں۔ بابل کے نواح میں برآمد ہوئے ہیں۔

---

[1] لیکن پنجاب یا گنگا جمنا کے دوآبہ میں یا مالوہ میں یعنی ایسے مقامات پر جو آریائی تہذیب کے زیرِ اثر رہے ہیں یہ قبور نہیں پائی جاتیں۔

نتیجہ | اس طول طویل اقتباس کے دینے سے یہاں مجھے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ جس قسم کے تابوت دکن میں پائے گئے ہیں۔ اسی قسم کے سندھ اور عراق میں بھی پائے گئے ہیں۔ پھر وادیٔ سندھ ایک عرصہ تک مختلف قوموں کے میل جول کا مرکز رہی ہے اور اس میں بابل و نینوا کے تمدن کی جھلک پائی جاتی ہے۔

چنانچہ سندھ میں موہنجوداڑو کی کھدائی میں ایسی مہریں ملی ہیں جو آشور و بابل کے مخلوطات سے مشابہ ہیں۔ ادھر دکن کی دراوڑی زبانوں کا تعلق، شمالی ہند کی آریائی زبانوں سے نہیں ہے بلکہ سندھ کی براہوئی زبان سے ان کا گہرا تعلق ہے اور اس سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ اس لئے اس قیاس کی قوی گنجائش ہے کہ کیا عجب ہے جو لفظ اُر (اُور) ارض نہرین (عراق)[1] سے براہ راست وادیٔ سندھ پہنچا ہو۔ اور یہاں سے پانچ نہروں کی سرزمین (پنجاب) میں دریائے راوی کے کنارے (لاہور) سیراب ہو کر سرزمین دکن پر قدم رکھا ہو اور یہاں کی دراوڑی زبانوں میں گھل مل گیا ہو۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم

---

[1] جدید انکشافات سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچی ہے کہ عراق کے شہر "اُور" ہی کو حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے وطن اور جائے پیدائش ہونے کا فخر حاصل ہے۔

"اور" کے معنی خود شہر کے ہیں پھر شہر کا نام شہر رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یثرب کا نام مدینہ تجویز فرمایا۔ جیسے آج کل شہر حیدرآباد کو یہاں کے لوگ صرف بلدہ کہتے ہیں۔